موجوں کا کہاں خاتمہ ہوتا ہے، کون بتا سکتا ہے۔ آواز فضا میں کہاں مدغم ہو جاتی ہے، کون جانتا ہے۔ حیات انسانی کا کہاں خاتمہ ہوتا ہے کون جانتا ہے، حیات انسانی اس موج کے سوا، اس آواز کے سوا اور کیا ہے، اس کی تحلیل بھی اتنی پرسکون، اتنی ہی غیر محسوس ہو۔ کیا تعجب ہے، عناصر کے معتقد پوچھتے ہیں کیا چیز نکل گئی؟ طبیعات کا معتقد کہتا ہے، ایک خفیف سی چمک نکل جاتی ہے، کوئی کہتا ہے آنکھوں سے جان نکلی۔ کوئی منہ سے، کوئی ان سے پوچھے موجیں فنا ہوتے وقت چمک کیا اٹھتی ہیں، آواز غائب ہوتے وقت کیا مجسم ہو جاتی ہے۔ وہ فنا اس ابدی سفر کی محض ایک منزل ہے، جہاں سفر کا خاتمہ نہیں بلکہ اس کی توسیع ہوتی ہے۔

کتنا حیرت انگیز انقلاب ہے، وہ جو مچھر کے ڈنک کو برداشت نہ کر سکتا تھا۔ اب اسے چاہے مٹی میں دبا دو، خواہ آگ کی چتا پر رکھ دو، اس کی پیشانی پر شکن نہ آئے گی۔

ٹیمل نے وکیل صاحب کے منہ کی طرف دیکھ کر کہا:

''بہو جی آئیے! مالک کو کھاٹ سے اتار دیں۔ وہ چلے گئے۔''

یہ کہہ کر وہ زمین پر بیٹھ گیا اور دونوں آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر رونے لگا۔ آج اس کی تیس سال کی رفاقت ختم ہو گئی۔ جس نے کبھی آدھی بات نہیں کہی، کبھی تو کر کے نہیں پکارا، وہ مالک اب اسے چھوڑے جا رہا ہے۔

رتن ابھی تک کبیراج کا انتظار کر رہی تھی۔ ٹیمل کے منہ سے یہ الفاظ سن کر اسے دھچکا سا لگا۔ اس نے اٹھ کر وکیل صاحب کی چھاتی پر ہاتھ رکھا۔ ساٹھ سال کی مسلسل حرکت کے بعد وہ اس وقت خاموش تھی۔ رتن کو پھر پیشانی پر ہاتھ رکھنے

کی ہمت نہ پڑی۔ اس جسم کو چھوتے ہوئے، اس بے جان چہرے کی طرف تاکتے ہوئے اسے کچھ احتراز ہو رہا تھا، جو استکراہ سے مشابہ تھا۔ ابھی جن قدموں پر سر رکھ کر وہ روتی تھی، اسے چھوتے ہوئے انگلیاں کٹی سی جاتی تھیں، رشتۂ حیات اتنا نازک ہے، اس نے ایسا کبھی نہ سمجھا تھا۔

ایک لمحہ کے بعد ٹیمل نے کہا:

''بہو جی! اب کیا دیکھتی ہو، کھاٹ سے نیچے اتار دو۔ جو ہونا تھا ہو گیا۔''

اس نے پیر پکڑا۔ رتن نے سر پکڑا اور لاش کو نیچے لٹا دیا۔ تب وہیں زمین پر بیٹھ کر رتن رونے لگی۔ اس لیے نہیں کہ دنیا میں اب کوئی اس کا دستگیر نہ تھا، بلکہ اس لیے کہ وہ اس کے ساتھ اپنا فرض پورا نہ کر سکی۔

اسی وقت موٹر کی آواز آئی اور کبیر اج نے کمرے میں قدم رکھا۔

شاید اب بھی رتن کے دل میں امید کی کوئی بجھتی ہوئی چنگاری چھپی پڑی تھی۔ اس نے فوراً آنکھیں پونچھ ڈالیں۔ سر کا آنچل سنبھال لیا۔ الجھے ہوئے بال سمیٹ لیے اور کھڑی ہو کر دروازے کی طرف دیکھنے لگی، مگر کبیر اج سے کچھ پوچھتے ہوئے اس کی روح کانپ رہی تھی۔

نور سحر نے آسمان کو اپنی سنہری کرنوں سے رنگین کر دیا تھا۔ کیا اس وجود کے خیر مقدم کی تیاریاں ہو رہی تھیں؟

اسی دن لاش کاشی لائی گئی۔ وکیل صاحب کے ایک بھتیجے مالوہ میں رہتے تھے، انہیں تار دے کر بلایا گیا۔ آخری مراسم انہی نے ادا کیے۔

جالپا آج کل سارے دن رتن ہی کے پاس بیٹھی رہتی تھی۔ بدنصیب رتن کو نہ گھر بار کی سدھ تھی، نہ کھانے پینے کی۔ روز ہی کوئی نہ کوئی ایسی بات یاد آ جاتی، جس سے رونے کا ایک بہانہ مل جاتا۔ شوہر کے ساتھ اس کے جو فرائض تھے، اس کے ایک حصے کی بھی اس نے تعمیل کی ہوتی تو اسے تسکین ہوتی۔ اپنی بے دردی، اپنی نافرض شناسی، اپنی آرائش پسندی کے چرچے کر کے ہی وہ اپنے ضمیر کو تشفی دیتی تھی۔ جب تک اس کی زندگی کے دروازے پر ایک محافظ بیٹھا ہوا تھا، اسے کسی کتے بلی یا چور چکار کا اندیشہ نہ تھا، لیکن اب دروازہ پر کوئی محافظ نہ تھا۔ اس لیے وہ ہوشیار رہتی تھی۔ شوہر کا ذکر خیر کرتی رہتی تھی۔ گزر بسر کیسے ہوگی، نوکروں چاکروں میں کس کس کو جواب دینا ہوگا۔ گھر کے کون کون سے خرچ کم کرنے کی ضرورت ہے۔ ان مسئلوں کے متعلق کوئی گفتگو ہی نہ ہوتی۔ گویا یہ فکر مرنے والے کی روح کے ساتھ بے وفائی ہوگی۔ کھانا، صاف کپڑے پہننا اور کچھ پڑھ کر دل بہلانا بھی اسے غیر مناسب سا معلوم ہوتا تھا۔ شرادھ کے دن اس نے اپنے سارے کپڑے اور زیور مہابرہمن کو دے ڈالے۔ ان چیزوں کی اب اسے کیا ضرورت ہے۔ اس کے برعکس شوہر کی چھوٹی سے چھوٹی چیز کو ان کی نشانی سمجھ کر وہ دیکھتی بھالتی رہتی تھی۔ اس کا مزاج اتنا متحمل ہوگیا تھا کہ کتنا ہی بڑا نقصان ہو جائے، اسے غصہ نہ آتا تھا۔ ٹیمل کے ہاتھ سے چائے کا سیٹ چھوٹ کر گر پڑا، لیکن رتن چیں بہ جبیں بھی نہیں ہوئیں۔ پہلے ایک دوات ٹوٹ جانے پر اس ٹیمل کو اس نے بری طرح

ڈانٹ پلائی تھی، مگر آج اس سے کئی گنے بڑے نقصان پر اس نے زبان تک نہ کھولی۔

وکیل صاحب کے بھتیجے کا نام تھا منی بھوشن۔ بڑا ہی ملنسار، خوش مزاج اور کارگزار۔ اسی ایک مہینے میں اس نے صدہا دوست بنا لیے۔ شہر میں جن جن وکیلوں اور رئیسوں سے وکیل صاحب کا یارانہ تھا، ان سبھی سے ایسا میل جول بڑھایا، ایسی بے تکلفی پیدا کی کہ رتن کو خبر تک نہ ہوئی اور اس نے بینک کا لین دین اپنے نام سے شروع کر دیا۔ الہ آباد بینک میں وکیل صاحب کے پچیس ہزار روپے جمع تھے، ان پر تو اس نے قبضہ کر ہی لیا۔ مکانوں کے کرائے بھی خود ہی وصول کرنے لگا۔ مواضعات کی تحصیل بھی شروع کر دی۔ گویا رتن سے کوئی مطلب ہی نہیں۔

ایک دن ٹیمل نے رتن سے آ کر کہا۔ ''بہو جی جانے والا تو چلا گیا۔ اب گھر بار کی بھی کچھ خبر لیجیے۔ میں نے سنا ہے، بھیا نے بینک کا سب حساب اپنے نام کر لیا۔''

رتن نے اس کی طرف ایسی غضب ناک آنکھوں سے دیکھا کہ پھر اسے کچھ کہنے کی ضرورت نہ ہوئی۔ اسی دن شام کو منی بھوشن نے ٹیمل کو نکال دیا۔ چوری کا الزام لگا کر نکالا، جس میں رتن کچھ کہہ بھی نہ سکی۔

اب صرف مہراج رہ گئے۔ انہیں منی بھوشن نے بھنگ پلا پلا کر ایسا ملایا کہ وہ انہی کا دم بھرنے لگے۔ مہری سے کہتے، بابو جی نے بڑا رئیسانہ مزاج پایا ہے۔ کوئی چیز لاؤ، کبھی نہیں پوچھتے کتنے کو لائے۔ بڑوں کے گھروں میں بڑے ہی پیدا ہو

تے ہیں۔ بہو جی تو بال کی کھال نکالتی رہتی تھیں۔ مہری کا منہ پہلے ہی سی دیا گیا تھا۔ اس کے ڈھلتے ہوئے حسن پر نئے مالک غیر معمولی طور پر فریفتہ ہو گئے تھے۔ وہ کسی نہ کسی بہانے سے باہر کے دیوان خانے میں ہی منڈلایا کرتی۔ رتن کو ذرا بھی خبر نہ تھی کہ کس طرح اس کے خلاف قلعہ بندی ہو رہی ہے۔

ایک دن منی بھوشن نے رتن سے کہا:

''کاکی! اب تو مجھے یہاں رہنا فضول معلوم ہوتا ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ آپ کو لے کر گھر چلا جاؤں۔ وہاں آپ کی بہو آپ کی خدمت کرے گی۔ بال بچوں میں جی بہل جائے گا اور خرچ بھی کم ہو جائے گا۔ آپ کہیں تو یہ بنگلہ بیچ کر دوں۔ اچھے دام اٹھیں گے۔''

رتن اس طرح چونکی، گویا کسی نے اسے جھنجھوڑ کر جگا دیا۔ بولی:

''کیا مجھ سے کچھ کہہ رہے ہو؟''

منی بھوشن:

''جی ہاں، کہہ رہا تھا کہ اب ہم لوگوں کو یہاں رہنا فضول ہے، اب تو یہاں سے چلے جانا ہی بہتر ہے۔''

رتن نے بے دلی سے کہا: ''ہاں اچھا تو ہوگا۔''

منی بھوشن: ''کاکا جی نے کوئی وصیت لکھی ہو۔ لائیے دیکھوں۔ ان کی مرضی ہمارے لیے مقدم ہے۔''

رتن نے اسی طرح آسمان پر بیٹھے ہوئے گویا دنیا کی باتوں سے اسے کوئی علاقہ نہیں ہے، جواب دیا:

''وصیت تو نہیں لکھی اور اس کی ضرورت بھی کیا تھی؟''

منی بھوشن نے پھر پوچھا: ''شاید کہیں لکھ کر رکھ گئے؟''

منی بھوشن نے دل میں خوش ہو کر کہا: ''میری خواہش ہے کہ ان کی کوئی یادگار بنوا دی جائے۔''

رتن نے خوش ہو کر کہا: ''میں بھی یہی چاہتی ہوں۔''

منی: ''گاؤں کی آمدنی کوئی تین ہزار روپیہ سال کی ہے۔ یہ آپ کو معلوم ہے، اتنا ہی وہ سال بھر میں خیرات کرتے تھے۔ دو ڈھائی سو سے کہیں مہینہ میں کم نہ ہوتا تھا۔ میری تجویز ہے کہ وہ ساری مدیں جیوں کی تیوں قائم رہیں۔''

رتن نے اسی لہجہ میں کہا: ''ہاں اور کیا؟''

منی: ''تو گاؤں کی آمدنی تو خیراتی کاموں کے لیے وقف کر دی جائے۔ مکانوں کا کرایہ کوئی دو سو روپے ماہوار ہے۔ اس سے ان کے نام ایک چھوٹی سی سنسکرت پاٹھ شالہ کھول دی جائے۔''

رتن: ''بہت اچھا ہوگا۔''

''اور یہ بنگلہ بیچ دیا جائے۔ اس روپے کو بینک میں رکھ دیا جائے۔''

رتن: ''بہت اچھا ہوگا، مجھے روپے پیسے کی اب کیا ضرورت ہے؟''

منی: ''آپ کی خدمت کے لیے تو ہم سب حاضر ہی ہیں۔ موٹر کار بھی نکال دی جائے۔ ابھی سے انتظام ہوگا تو جا کر کہیں دو تین مہینے میں فرصت ملے گی۔''

رتن نے لاپروائی سے کہا: ''ابھی جلدی کیا ہے، کچھ روپیہ بینک میں تو ہے۔''

منی: ''بینک میں روپے تھے، مگر مہینہ بھر سے خرچ بھی تو ہو رہے ہیں۔ ہزار

پانچ سو پڑے ہوں گے۔ یہاں تو روپے پیسے ہوا میں اڑ جاتے ہیں۔ مجھ سے تو یہاں ایک مہینہ بھی نہ رہا جائے۔ موٹر کو بھی جلدی سے نکال دینا چاہیے۔''

رتن نے اس کے جواب میں یہی کہا اچھا تو ہوگا، وہ اس دماغی تعطل کی حالت میں تھی، جب انسان کو چھوٹے چھوٹے کام بھی اسوجھ معلوم ہونے لگتے ہیں۔ منی بھوشن کی کارپردازیوں نے اسے مغلوب کر دیا تھا۔ اس وقت اس کے ساتھ جو شخص تھوڑی سی ہمدردی ظاہر کر دیتا، اس پر کوئی نقش بھی آسانی سے جم سکتا تھا۔ اس وقت سبھی اسے اپنے نظر آتے تھے۔ اسے کسی پر شبہ نہ تھا۔ کسی سے ضرر کا خوف نہ تھا۔ شاید کوئی چور بھی اس کے سامنے اس کا مال و متاع اٹھا لے جاتا تو شور نہ مچاتی۔

(32)

تیرہویں کے بعد جالپا نے رتن کے گھر آنا جانا کم کر دیا تھا۔ صرف ایک بار گھنٹہ دو گھنٹہ کے لیے چلی جایا کرتی تھی۔ ادھر کئی دنوں سے منشی دیانا تھ کو بخار آنے لگا تھا۔ انہیں بخار میں چھوڑ کر کیسے جاتی؟ منشی جی کو ذرا بھی بخار آ جاتا تو بک جھک کرنے لگتے تھے۔ کبھی گاتے، کبھی روتے۔ کبھی موت کے فرشتوں کو اپنے سامنے ناچتے دیکھتے۔ ان کا جی چاہتا کہ سارا گھر میرے پاس بیٹھا رہے۔ بلکہ رشتہ داروں کو بھی بلا لیا جائے تا کہ وہ سب سے آخری ملاقات کر لیں، کیونکہ اس بیماری سے بچنے کی انہیں کوئی امید نہ تھی۔ جاگیشری اور سب کچھ کر سکتی تھی، مگر ہر زہ

سرائیاں نہ سن سکتی تھی۔ جیوں ہی وہ رونے لگتے، وہ کمرے سے نکل جاتی۔ اسے آسیب کا اندیشہ تھا۔

منشی جی کے کمرے میں کئی اخباروں کے فائل تھے۔ یہی انہیں ایک شوق تھا۔ جالپا کا جی وہاں بیٹھے بیٹھے گھبرانے لگتا تو ان فائلوں کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگتی۔ ایک دن اس نے ایک پرانے اخبار میں ایک شطرنج کا نقشہ دیکھا، جسے حل کر دینے کے لیے کسی رئیس نے انعام دے رکھا تھا۔ اسے خیال آیا کہ جس طاق پر رمانا تھ کی بساط اور مہرے رکھے ہوئے ہیں، اسی پر ایک کتاب میں نقشے بھی دیئے ہوئے ہیں۔ وہ فوراً دوڑتی ہوئی اوپر گئی اور کتاب اٹھا لائی۔ یہ نقشہ اسی کاپی میں موجود تھا اور نقشہ ہی نہ تھا، اس کا حل بھی دیا ہوا تھا۔ معاً جالپا کو یہ خیال پیدا ہوا۔ اس نقشہ کو کسی اخبار میں چھپوا دوں تو کیسا ہو۔ شاید رمانا تھ کی نگاہ اس پر پڑ جائے۔ یہ نقشہ اتنا آسان تو نہیں ہے کہ آسانی سے حل ہو جائے۔ اس نے سوچا، اس شہر میں جب ان کا ثانی کوئی نہیں ہے تو ایسے لوگوں کی تعداد بہت نہیں ہو سکتی، جو یہ نقشہ حل کر سکیں۔ کچھ بھی ہو، جب رمانا تھ نے یہ نقشہ حل کیا ہے تو یقیناً وہ اسے پھر حل کر لیں گے۔ جو لوگ پہلی بار دیکھیں گے، انہیں سوچنے میں دو ایک دن ضرور لگ جائیں گے۔ جالپا نے اس نقشہ کو حل کرنے کے لیے کچھ انعام مقرر کر دینے کا فیصلہ کیا ہوا تو ہے ہی، انہیں روپے نہ ملیں تاہم اتنا تو ممکن ہے ہی کہ حل کرنے والوں میں ان کا نام ہو۔ اس طرح کچھ پتا لگا جائے گا۔ کچھ بھی نہ ہو، روپے ہی تو جائیں گے۔

اسی ادھیڑ بن میں وہ آج رتن سے نہ مل سکی۔ رتن دن بھر تو اس کی راہ دیکھتی

رہی۔ جب وہ شام کو بھی نہ گئی تو اس سے رہا نہ گیا۔ آج وہ شوہر کی وفات کے بعد پہلی بار گھر سے نکلی ہے۔ اسے تیز موٹر چلانے کی دھن تھی، لیکن آج موٹر کی رفتار تانگے سے بھی سست تھی۔ ایک بڑھیا کو سڑک کے کنارے بیٹھے دیکھ کر اپنی موٹر کو روک دیا اور اسے چار آنے کے پیسے دے دیئے اور آگے بڑھی تو دو کانسٹیبل ایک قیدی کو لے جا رہے تھے۔ اس نے موٹر روک کر ایک کانسٹیبل کو بلایا اور اسے ایک روپیہ دے کر کہا۔ اس قیدی کو مٹھائی کھلا دینا۔ کانسٹیبل نے سلام کر کے روپیہ لے لیا۔ آج کسی خوش نصیب کا منہ دیکھ کر اٹھا تھا۔ جالپا نے اسے دیکھتے ہی کہا:

''معاف کرنا بہن! آج میں نہ آ سکی۔ دادا کو کئی دن سے بخار آ رہا ہے۔''

رتن نے منشی جی کے کمرے کی طرف قدم اٹھایا اور پوچھا:

''وہیں ہیں نا، تم نے مجھ سے نہیں کہا؟''

منشی جی کا بخار اس وقت کچھ اترا ہوا تھا۔ رتن کو دیکھ کر بولے:

''بہت رنج ہوا دیوی جی، مگر یہ تو دنیا ہے۔ آج ایک کی باری ہے، کل دوسرے کی باری ہے۔ چل چلاؤ لگا ہوا ہے۔ اب میں بھی چلا۔ اب نہیں بچ سکتا۔ بڑی پیاس ہے، جیسے سینے میں کوئی بھٹی جل رہی ہو۔ پھنکا جاتا ہوں۔ کوئی اپنا نہیں ہوتا۔ دیوی جی دنیا کے ناتے سب غرض کے ناتے ہیں۔ آدمی ہاتھ پسارتے اکیلا ایک دن چلا جاتا ہے۔ رما ہوتا تو آج ایک چلو پانی تو دیتا۔ دو لونڈے ہیں، انہیں کوئی فکر ہی نہیں۔ میں مروں یا جیوں۔ یہاں بیٹھتے دونوں کا دم گھٹتا ہے۔ آپ سے یہ آخری ملاقات ہے۔''

رتن نے تشفی دی: ''یہ ملیریا ہے لالہ جی! دو چار دن میں آپ اچھے ہو جائیں

گے۔گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔''

منشی جی نے بیکسانہ انداز سے کہا: ''بیٹھ جایئے دیوی جی، آپ کی دعا ہے تو شاید بچ جاؤں لیکن مجھے امید تو نہیں ہے۔ میں بھی ٹال ٹھونک کر یم راج سے لڑنے کو تیار بیٹھا ہوں۔ اسی طرح وہاں بھی کچہریاں ہیں، حاکم ہیں، راجا ہیں، تقریریں ہوتی ہیں، اخبار نکلتے ہیں۔ پھر کیا فکر ہے۔ وہاں بھی اہلمد ہو جاؤں گا۔''

رتن کو ایسی ہنسی چھوٹی کہ وہاں کھڑی نہ رہ سکی۔ منشی جی مذاق میں یہ باتیں نہیں کر رہے تھے۔ ان کا لب ولہجہ نہایت درجہ متین تھا۔ آج ڈیڑھ دو مہینہ کے بعد رتن کو ہنسی آئی اور اس بے موقع ہنسی کو چھپانے کے لیے وہ کمرے سے نکل گئی۔ اس کے ساتھ جالپا بھی باہر آ گئی۔

رتن نے معذرت آمیز لہجہ میں کہا: ''دادا جی نے دل میں کیا سمجھا ہوگا۔ سوچتے ہوں گے، میں تو جان سے مر رہا ہوں اور اسے ہنسی سوجھتی ہے۔ اب وہاں نہ جاؤں گی۔ نہیں ایسی بات پھر کہیں تو میری ہنسی نہ رکے گی۔ دیکھو تو آج کتنی بے موقع ہنسی آئی ہے۔''

جالپا نے اس کے دلی جذبات کو تاڑ کر کہا: ''مجھے اکثر ان کی باتوں پر ہنسی آ جاتی ہے۔ اس وقت ہنسی روکنا مشکل ہو جاتا ہے۔ آج سویرے کہنے لگے، میرا پیٹ بھک ہو گیا۔ میرا پیٹ بھک ہو گیا۔ اس کی رٹ لگا دی۔ اس کا مطلب کیا تھا، نہ سمجھ سکی، نہ اماں سمجھ سکیں، مگر وہ برابر یہی رٹ لگائے جاتے تھے۔ آؤ کمرے میں چلیں۔''

رتن: ''میرے ساتھ نہ چلو گی؟''

''آج تو نہ چل سکوں گی۔''

''کل آؤ گی؟''

''کہہ نہیں سکتی۔ دادا کی طبیعت اچھی رہی تو آؤں گی۔''

''نہیں بھائی ضرور آنا۔ تم سے ایک صلاح کرنا ہے۔''

''کیا صلاح ہے؟''

''منی کہتے ہیں، یہاں اب رہنا فضول ہے۔ ان کی صلاح ہے بنگلہ بیچ دیا جائے اور ہم لوگ مالوہ چلے جائیں۔''

جالپا تعجب سے بولی: ''یہ تو تم نے بری خبر سنائی۔ بہن مجھے اس حالت میں چھوڑ کر چلی جاؤ گی، میں نہ جانے دوں گی۔ منی سے کہہ دوں گی تم کل ایک ہفتہ باہر رہیں۔ مجھے ایک ایک پل پہاڑ ہو گیا۔ اب تو شاید میں ہی جاؤں۔ نہیں بہن تمہارے پیروں پڑتی ہوں۔ ابھی جانے کا نام نہ لو۔''

رتن بھی آبدیدہ ہو کر بولی: ''مجھ سے بھی وہاں نہ رہا جائے گا۔ سچ کہتی ہوں تو منی سے کہہ دوں گی مجھے نہیں جانا ہے۔''

جالپا اس کا ہاتھ پکڑے ہوئے کمرے میں لے گئی اور اس کے گلے میں ہاتھ ڈال کر طفلانہ انداز سے بولی: ''قسم کھاؤ کہ مجھے چھوڑ کر نہ جاؤ گی؟''

رتن نے اسے آغوش میں لے کر کہا۔ ''لو قسم کھاتی ہوں، نہ جاؤں گی۔ چاہے ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے۔ میرے لیے وہاں کیا رکھا ہے۔ بنگلہ بھی کیوں بیچوں۔ دو ڈھائی سو مکانوں کا کرایہ ہے۔ ہم دونوں کے گزارے کے لیے کافی ہے۔ میں ابھی منی سے کہہ دوں گی، نہ جاؤں گی۔''

دفعتاً فرش پر مہرے اور شطرنج کو دیکھ کر پوچھا: ''یہ شطرنج کس کے ساتھ کھیل رہی تھیں؟''

جالپا نے شطرنج کے نقشہ پر اپنی تقدیر کا پانسہ پھینکنے کی جو تجویز سوچی تھی، وہ اسے کہہ سنائی۔ دل میں ڈر رہی تھی کہ رتن کہیں اس تجویز کو پاگل پن نہ خیال کرے، لیکن رتن سنتے ہی باغ باغ ہوگئی۔ بولی: ''دس روپے کا انعام تو بہت کم ہے، پچاس روپے کر دو۔ روپے میں دیتی ہوں۔''

جالپا نے اعتراض کیا: ''تب تو بڑے بڑے شطرنج باز میدان میں آ جائیں گے۔''

رتن: ''کوئی مضائقہ نہیں۔ بابو جی کی نگاہ پڑ گئی تو وہ اسے ضرور حل کر لیں گے اور مجھے امید ہے، سب سے پہلے انہی کا نام آوے گا۔ کچھ نہ ہوگا تو پتا لگ ہی جائے گا۔ تم نے بڑی اچھی تدبیر سوچ نکالی۔''

جالپا نے پوچھا: ''تو تمہیں امید ہے؟''

''پوری، میں کل سویرے روپے لے کر آؤں گی۔''

''تو میں آج خط لکھ رکھوں گی۔ کسی مشہور اخبار میں بھیجنا چاہیے۔''

''کلکتہ میں تو زیادہ تر لوگ ''وشومتر'' ہی پڑھتے نظر آتے ہیں۔

اسی وقت منشی جی پکار اٹھے: ''بہو، بہو!''

جالپا تو لپکی ہوئی ان کے کمرے کی طرف چلی، رتن باہر جا رہی تھی کہ جاگیشری پنکھا جھلتی نظر آئیں۔

رتن نے پوچھا: ''تمہیں گرمی لگ رہی ہے اماں جی! میں تو مارے سردی کے

کانپ رہی ہوں، ارے تمہارے پاؤں میں کیا سفید سفید لگا ہوا ہے؟ کیا آٹا پیس رہی تھیں؟''

جاگیشری نے شرمندہ ہو کر کہا: ''ہاں وید جی نے انہیں ہاتھ کے آٹے کی روٹی کھانے کو کہا ہے۔ بازار میں ہاتھ کا آٹا کہاں میسر۔ محلّہ میں کوئی پسنہاری نہیں ملتی۔ مزدورنیں تک چکی میں آٹا پسوا لیتی ہیں، کوئی ملتی ہی نہیں۔''

رتن نے تعجب سے پوچھا: ''تم سے چکی چل جاتی ہے؟''

جاگیشری مسکرا کر بولی: ''کون بہت سا گیہوں تھا۔ پاؤ بھر تو دونوں وقت کے لیے کافی ہو جاتا ہے۔ ایک لقمہ بھی نہیں کھاتے۔ بہو پینے جا رہی تھی مگر پھر مجھے ان کے پاس بیٹھنا پڑتا۔ مجھے رات میں چکی پیسنا منظور ہے، ان کے پاس گھنٹے بھر بیٹھنا منظور نہیں۔

رتن جا کر جانت کے پاس ایک منٹ کھڑی رہی۔ پھر مسکرا کر مانجی پر بیٹھ گئی اور بولی: ''تم سے تو یہ جانت نہ چلتا ہوگا ماں، لاؤ تھوڑا سا گیہوں مجھے دو، دیکھوں تو۔''

جاگیشری نے کانوں پر ہاتھ رکھا اور کہا: ''ارے نہیں بہو، تم کیا پیسو گی، چلو یہاں سے۔''

رتن نے اپنی قابلیت کا ثبوت دیا: ''میں نے بہت دنوں تک پیسا ہے، اماں۔ جب اپنے گھر تھی تو روز پیستی تھی۔ لاؤ تھوڑا سا گیہوں لاؤ۔''

''ہاتھ دکھنے لگے گا، چھالے پڑ جائیں گے۔''

''کچھ نہیں ہوگا ماجی۔ آپ گیہوں تو لائیے۔''

جاگیشری نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھانے کی کوشش کر کے کہا: ''گیہوں گھر میں نہیں ہے۔ اب اس وقت بازار سے کون لاوے۔''

رتن کو اعتبار نہ آیا، بولی: ''اچھا چلیے۔ میں آپ کے بھنڈارے میں دیکھوں، ہوگا کیسے نہیں؟''

رسوئی کی بغل والی کوٹھڑی میں کھانے کا سامان رہتا تھا۔ رتن اندر چلی گئی اور ہانڈیوں میں ٹٹول کر دیکھنے لگی۔ ایک ہانڈی میں گیہوں نکل آئے، خوش ہو کر بولی: ''دیکھو اماں! نکلے کہ نہیں، تم مجھ سے بہانہ کر رہی تھیں۔''

اس نے ایک ڈلیا میں تھوڑے سے گیہوں نکال لیے اور خوش خوش جانت پر جا کر پیسنے لگی۔

جاگیشری نے جا کر جالپا سے کہا: ''بہو وہ جانت پر بیٹھی گیہوں پیس رہی ہے۔ اٹھاتی ہوں، اٹھتی ہی نہیں۔ کوئی دیکھ لے تو کیا کہے؟''

جالپا نے منشی جی کے کمرے سے نکل کر ساس کی پریشانی کا مزہ اٹھانے کے لیے کہا: ''یہ تم نے کیا غضب کیا۔ اماں سچ مچ کوئی دیکھ لے تو ناک ہی کٹ جائے۔ چلیے دیکھوں۔''

جاگیشری نے مجبوری کے انداز سے کہا: ''میں تو سمجھا کے ہار گئی، مانتی ہی نہیں۔''

جالپا نے جا کر دیکھا تو رتن گیہوں پیسنے میں مگن تھی۔ تفریح کی فطری مسرت سے اس کا چہرہ شگفتہ ہو رہا تھا۔ اتنی ہی دیر میں اس کے ماتھے پر پسینہ کی بوندیں آ گئی تھیں۔ اس کے مضبوط ہاتھوں میں جانت لٹو کی طرح ناچ رہا تھا۔

جالپا نے ہنس کر کہا: ''اوری آٹا مہین ہو، ورنہ پیسے نہ ملیں گے۔''

رتن کو سنائی نہ دیا۔ بہروں کی طرح اس کے منہ کی طرف تاک کر مسکرائی۔

جالپا نے اور زور سے کہا: ''آٹا خوب مہین پیسنا، نہیں تو پیسے نہ ملیں گے۔''

رتن نے بھی ہنس کر کہا: ''جتنا مہین کہیے اتنا مہین پیس دوں۔ بہو جی، پسائی اچھی ملنی چاہیے۔''

جالپا: ''دھیلے سیر۔''

رتن: ''دھیلی سیر ہی سہی۔''

''منہ دھو آؤ، دھیلے سیر ملے گی۔''

''میں یہ سب پیس کر اٹھوں گی، تم یہاں کیوں کھڑی ہو۔''

''آ جاؤں، میں بھی کچھوا دوں۔''

''جی چاہتا ہے، کوئی جانت کا گیت گاؤں۔''

جالپا نے جا گیشری کو منشی جی کے کمرے میں بھیج دیا اور جانت پر جا بیٹھی۔ دونوں سہیلیاں یہ گیت گانے لگیں:

''موہے جوگن بنا کے کہاں گئے رے جوگیا''

دونوں کے گلے میں لوچ تھا۔ جانت کا گھنگر، گھنگر ان کے گیت پر ساز کا کام دے رہا تھا۔ جب دونوں ایک کڑی گا کر خاموش ہو جاتیں تو جانت کی آواز گویا گیت کی آواز سے ہم آہنگ ہو کر اور بھی دلکش ہو جاتی تھی۔ دونوں کے دل اس وقت مسرت حیات کے فطری سرور سے پر تھے۔ نہ غم کا بوجھ تھا، نہ فراق کی خلش۔ گویا دو چڑیاں طلوع سحر کی کیفیتوں سے مست ہو کر چہک رہی تھیں۔

رمانا تھ کی چائے کی دکان کھل تو گئی، مگر صرف رات کو کھلتی تھی۔ رات کو بھی زیادہ تر دیبی دین ہی دکان پر بیٹھتا، لیکن بکری اچھی ہو جاتی تھی، پہلے ہی دن تین روپے کے پیسے آئے۔ دوسرے دن چار پانچ روپے کا اوسط پڑنے لگا۔ چائے اتنی لذیذ ہوتی تھی کہ جو ایک بار یہاں چائے پی لیتا، پھر دوسری دکان پر نہ جاتا۔ رما نے کچھ تفریح کا سامان بھی جمع کر دیا۔ چراغ جلنے کے بعد سبزی کی بکری زیادہ نہ ہوتی تھی۔ وہ ان ٹوکروں کو اٹھا کر اندر رکھ دیتا اور برآمدے میں میز لگا دیتا۔ اس پر تاش کا سیٹ رکھ دیتا۔ دو روزنامہ اخبار بھی منگانے لگا۔ دکان چل نکلی۔

ان چار پانچ مہینوں کے افلاس نے رما کے ذوق تن پروری کو اور بھی تیز کر دیا تھا۔ جب تک روپے نہ تھے، وہ مجبور تھا۔ روپے ہاتھ میں آتے ہی سیر و تفریح کا جنون سر پر سوار ہو گیا۔ سینما کی بھی یاد آئی۔ روزمرہ کی جن ضروریات کو وہ اب تک ٹالتا آتا تھا، خریدی جانے لگیں۔ دیبی دین کے لیے ایک خوشنما ریشمی چادر لایا۔ جگو کے سر میں اکثر درد ہوتا رہتا تھا۔ ایک دن تیل کی خوشبودار دو شیشیاں لا کر دے دیں۔ دونوں نہال ہو گئے۔ اب بڑھیا کبھی اپنے سر پر بوجھ اٹھاتی تو اسے ڈانٹتا۔ اب تو میں بھی چار پیسے کمانے لگا ہوں، اب تو کیوں جان دیتی ہے؟ اگر پھر کبھی تیرے سر پر ٹوکری دیکھی تو کہے دیتا ہوں، دکان اٹھا کر پھینک دوں گا۔ بڑھیا لڑکے کی یہ ڈانٹ سن کر باغ باغ ہو جاتی۔ منڈی سے بوجھ لاتی تو پہلے چپکے سے دیکھتی۔ رما دکان پر تو نہیں ہے۔ اگر وہ بیٹھا ہوتا تو کسی قلی کو ایک دو پیسے دے

کر اس کے سر پر رکھ دیتی۔ وہ نہ ہوتا تو لپکی ہوئی آتی اور جلدی سے بوجھ اتار کر اطمینان سے بیٹھ جاتی، تاکہ رما بھانپ نہ سکے۔

ایک دن منور ما تھیٹر میں آغا حشر کا کوئی نیا ڈرامہ آنے والا تھا۔ اس ڈرامے کی بڑی دھوم تھی۔ ایک دن پہلے ہی سے لوگ اپنی اپنی جگہیں ریزرو کرا رہے تھے۔ رما کو بھی اپنی جگہ ریزرو کرانے کی دھن سوار ہوئی۔ سوچا کہیں رات کو ٹکٹ نہ ملا تو ٹاپتے ہی رہ جائیں گے۔ یہ اشتیاق پولیس کے خوف پر بھی غالب آ گیا۔ ایسی آفت نہیں آئی ہے کہ گھر سے نکلتے ہی پولیس گرفتار کر لے۔ دن کو نہ سہی رات کو نکلتا ہی ہوں۔ پولیس چاہتی تو کیا رات کو نہ گرفتار کر لیتی۔ پھر میرا وہ حلیہ بھی نہیں رہا۔ تبدیلی ہیئت کے لیے پگڑی کافی ہے۔ یوں دل کو سمجھا کر وہ دس بجے گھر سے نکلا۔

دیبی دین کہیں گیا ہوا تھا۔ بڑھیا نے پوچھا:

''کہاں جاتے ہو بیٹا؟''

رما نے کہا: ''کہیں نہیں، ابھی آتا ہوں۔''

رما سڑک پر آیا تو اس کی ہمت برف کی طرح پگھلنے لگی۔ قدم قدم پر خوف ہوتا تھا۔ کوئی کانسٹیبل نہ آ رہا ہو۔ اسے یقین تھا کہ پولیس کا ایک ایک چوکیدار بھی اس کا حلیہ پہچانتا ہے۔ اس لیے وہ سر نیچے جھکائے چل رہا تھا۔ دفعتاً اسے خیال آیا خفیہ پولیس کے جاسوس سادہ لباس میں ادھر ادھر گھوما کرتے ہیں۔ کون جانے جو آدمی میری بغل میں آ رہا ہے، کوئی جاسوس ہی ہو۔ میری طرف کتنے غور سے دیکھ رہا ہے۔ یوں سر جھکا کر چلنے ہی سے شاید اسے شبہ ہو رہا ہے۔ یہاں اور سبھی آدمی

سامنے دیکھ رہے ہیں۔کوئی سر جھکا کر نہیں چل رہا ہے۔موٹروں کی اس ریل پیل میں سر جھکا کر چلنا موت کو دعوت دینا ہے۔پارک میں کوئی اس طرح چہل قدمی کرے تو کر سکتا ہے۔یہاں تو نگاہ سامنے ہونا چاہیے،لیکن بغل دار آدمی ابھی تک میری ہی طرف تاک رہا ہے۔ہے کوئی خفیہ ہی۔رما اس کا ساتھ چھوڑنے کے لیے ایک تمبولی کی دکان پر پان کھانے لگا۔وہ آدمی آگے نکل گیا رما نے آرام کی لمبی سانس لی۔

اب اس نے سر اٹھالیا اور دل مضبوط کر کے چلنے لگا۔اس وقت ٹرام کا بھی کہیں پتا نہ تھا،نہیں تو اس پر بیٹھ جاتا۔تھوڑی ہی دور چلا ہوگا کہ اسے تین کانسٹیبل پیچھے سے آتے دکھائی دیئے۔اس نے سڑک چھوڑ دی اور پٹری پر چلنے لگا۔خواہ مخواہ سانپ کے بل میں انگلی ڈالنا کون سی بہادری ہے۔مگر وائے نصیب تینوں کانسٹیبلوں نے بھی سڑک چھوڑ کر وہی پٹری لے لی۔رما کا کلیجہ دھک دھک کرنے لگا۔دوسری پٹری پر جانا اس شبہ کو اور بھی طاقت پہنچائے گا۔کوئی ایسی گلی بھی نہیں، جس میں گھس جائے۔اب تو سب بہت قریب آ گئے۔کیا بات ہے کہ سب میری ہی طرف دیکھ رہے ہیں۔میں نے بڑی حماقت کی کہ یہ پگڑ باندھ لیا اور باندھا بھی کتنے بے تکے پن سے۔ایک ٹیلہ سا اوپر اٹھ گیا ہے۔یہ پگڑی آج مجھے پکڑوائے گی۔باندھی تھی اس سے صورت بدل جائے گی،یہ الٹے اور تماشا بن گئی۔تینوں میری طرف دیکھ دیکھ کر آپس میں کچھ باتیں کر رہے ہیں۔شاید میرا حلیہ ملا رہے ہیں۔اب نہیں بچ سکتا۔گھر والوں کو میری گرفتاری کی خبر ملے گی تو کتنے شرمندہ ہوں گے۔جالپا تو رو رو کر جان ہی دے دے گی۔پانچ سال سے کم سزا نہ ہوگی۔

بس زندگی کا خاتمہ ہی سمجھو۔

اس تخیل کا اس کے دل پر ایسا غلبہ ہوا کہ اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ جب کانسٹیبلوں کی جماعت قریب آ گئی تو اس کا چہرہ خوف سے کچھ ایسا تبدیل ہو گیا۔ آنکھوں میں کچھ ایسا خوف نمودار ہو گیا اور وہ کچھ اس طرح دوسرے آدمیوں کی آڑ تلاش کرنے لگا کہ عام آدمیوں کو اس پر شبہ ہونا قدرتی بات تھی۔ پھر پولیس والوں کی منجھی ہوئی آنکھیں کیوں چوکتیں؟

ایک نے رماناتھ کو للکارا: ''او جی، او پگڑی! ذرا ادھر آنا، تمہارا نام کیا ہے؟''

رماناتھ نے سینہ زوری کے انداز سے کہا: ''ہمارا نام پوچھ کر کیا کرو گے؟ کیا میں چور ہوں؟''

''چور نہیں۔ تم شاہ ہی۔ نام کیوں نہیں بتاتے؟''

رما نے ایک لمحہ کے بعد مسلسل رنج کے ساتھ کہا: ''بیرا الل۔''

''گھر کہاں ہے؟''

''ہاں گھر ہی پوچھتے ہیں!''

''شاہجہان پور۔''

''کون محلّہ؟''

رما شاہجہان پور نہ گیا تھا۔ نہ اتنی جرأت ہوئی کہ کوئی فرضی ہی نام بتا دے۔

دلیری سے بولا: ''تم تو گویا میرا حلیہ لکھ رہے ہو؟''

کانسٹیبل نے بھبکی دی۔ ''تمہارا حلیہ پہلے ہی لکھا ہوا ہے، نام جھوٹ بتایا، سکونت جھوٹ بتائی، محلّہ پوچھا تو بغلیں جھانکنے لگے۔ مہینوں سے تمہاری ہی تلاش

ہو رہی ہے۔ آج جا کر ملے ہو۔ چلو تھانے پر۔''

یہ کہتے ہوئے اس نے رما کا ہاتھ پکڑ لیا۔ رما نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا:

''وارنٹ لاؤ تب میں چلوں گا۔ کیا مجھے کوئی دیہاتی سمجھ لیا ہے؟''

کانسٹیبل نے اپنے ساتھی سے کہا: ''پکڑ لو جی ان کا ہاتھ، وہیں تھانے پر وارنٹ دکھایا جائے گا۔''

شہروں میں وارداتیں مداری کے تماشے سے بھی دلچسپ ہوتی ہیں۔ سینکڑوں آدمی جمع ہو گئے۔ شامت کا مارا دیبی دین اسی وقت افیم لے کر لوٹ رہا تھا۔ یہ جماؤ دیکھ کر وہ بھی آ گیا۔ دیکھا کہ تین کانسٹیبل رما ناتھ کو گھسیٹے ہوئے لیے جا رہے ہیں۔

آگے بڑھ کر بولا: ''ہائیں ہائیں جمعدار یہ کیا کرتے ہو۔ پنڈت جی تو ہمارے مہمان ہیں۔ انہیں کہاں پکڑے لیے جاتے ہو؟''

کانسٹیبل دیبی دین کو پہچانتے تھے۔ ایک نے پوچھا: ''تمہارے مہمان ہیں یہ کب سے؟''

دیبی دین نے دل میں حساب لگا کر کہا: ''چار مہینے سے کچھ زیادہ ہیہ ہوئے ہوں گے۔ مجھے پراگ راج میں مل گئے تھے۔ رہنے والے بھی وہیں کے ہیں۔ میرے ساتھ ہی تو آئے تھے۔''

کانسٹیبل نے دل میں خوش ہو کر کہا ''ان کا نام کیا ہے؟''

دیبی دین نے سٹپٹا کر کہا: ''نام انہوں نے بتایا نہ ہوگا۔''